مرحوم ڈاکٹر ضیاءالحق

ڈاکٹر ضیاءالحق ۷ر اگست ۱۹۹۸ء کو وفات پا گئے۔ جس خاموشی سے وہ تحقیق و تصنیف کے کام میں عمر بھر مصروف رہے، ایسے ہی چپ چاپ چلے گئے۔ نہ کسی اخبار میں خبر لگی، نہ کسی وزیر اور مدیر کا تعزیتی پیغام چھپا۔ اگر ایسا ہوتا تو غالباً ڈاکٹر ضیاءالحق کی روح کو صدمہ بھی ہوتا۔ لیکن ہمیں تو اس لئے افسوس ہے کہ یہ اکیلا شخص اسلام کے معاشی نظریات پر بنیادی اہمیت کا تحقیقی کام کر رہا تھا جو اس کے جانے سے نامکمل رہ گیا۔ اس موضوع پر یوں تو بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کئی ادارے قائم ہیں، لیکن ڈاکٹر ضیاءالحق جس لگن کے ساتھ آخر دم تک اس موضوع پر فکر انگیز تحریریں پیش کرتے رہے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

ضیاءالحق میانی افغاناں، ہوشیارپور، مشرقی پنجاب میں ایک محنت کش حاکم علی کے گھر ۳ر جنوری ۱۹۳۶ کو پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد سندھ میں سکھر وطن بنایا ۱۹۵۴ء میں میٹرک کیا تو حساب میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ سندھ یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۹ء میں بی۔ اے کیا۔ پھر اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں اکنامکس میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ یہیں سے اعلیٰ تعلیم کے لیے شکاگو یونیورسٹی امریکہ چلے گئے، جہاں سے عربی اور اسلامیات میں ۱۹۷۲ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۷۵ء میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ یہاں انہیں عربی اور اسلامیات کے علاوہ معاشیات اور تاریخ معاشیات کے ماہرین سے بھی استفادے کا موقع ملا۔

۱۹۷۵ء میں واپس ادارۂ تحقیقات اسلامی آئے تو انہیں ادارے کے انگریزی مجلّہ اسلامک سٹڈیز کی ادارت کے فرائض سونپے گئے۔ ۱۹۸۰ء تک وہ اس کے ایڈیٹر رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اسلامی معاشیات پر اپنی تحقیقات کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۰ء میں انہوں نے ربا کے موضوع پر اپنی کتاب اشاعت کے لیے پیش کی، لیکن غالباً ان کی انقلابی فکر کی بناء پر اس کی اشاعت کی منظوری نہیں ملی۔

جس زمانے میں ضیاءُ الحق صاحب امریکہ گئے، ادارۂ تحقیقات اسلامی اور اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم کے خلاف مہم زوروں پر تھی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی مخالفت کے دیگر اسباب میں ایک بڑا سبب ان کی حکومت وقت سے قربت بھی تھی۔ چنانچہ علماء کی طرف سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ ادارہ حکومت کا آلہ کار بن چکا ہے۔ ڈاکٹر ضیاءُ الحق بھی آزادیٔ تحقیق کے قائل تھے۔ چنانچہ جب واپس آئے تو ادارۂ تحقیقات اسلامی، وزارت مذہبی امور سے منسلک ہو چکا تھا، جس کی سربراہی مرحوم مولانا کوثر نیازی کر رہے تھے۔ مرحوم مولانا کے دور میں بھی ڈاکٹر ضیاءُ الحق کا یہی اصرار رہا کہ ادارے کو اپنی تحقیقات میں آزاد رہنا چاہیے۔ جنرل ضیاءُ الحق کی حکومت میں صورت حال زیادہ گھمبیر ہو گئی کیونکہ حکومت ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے وزارت اطلاعات اور مذہبی امور سے بھرپور کام لے رہی تھی۔ اگرچہ اس عرصے میں ادارۂ تحقیقات اسلامی وزارت مذہبی امور سے الگ ہو کر اسلامی یونیورسٹی کا حصہ ہو گیا تھا لیکن تحقیقات میں حکومت کی دخل اندازی زیادہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ضیاءُ الحق کا اصرار اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ادارے یا یونیورسٹی کو حکومت سے آزاد رہ کر کام کرنا چاہیے۔ اس میں پیچیدگی اس لئے بھی بڑھ گئی تھی کہ جنرل ضیاءُ الحق کے دور میں اسلام کی ایک مخصوص تعبیر کو نافذ کیا جا رہا تھا۔ خصوصاً اسلامی معاشیات کے نام سے ایک ایسی تعبیر مسلط کی جا رہی تھی جو ڈاکٹر ضیاءُ الحق کی نظر میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو اسلام کے نام سے مستحکم کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ مارشل لاء کے دور میں ان کی تحقیقات کا شائع ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ ان کے اختلافات شدید

ہوتے گئے۔ جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے تو انہوں نے ادارہ سے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ اپنے استعفیٰ میں انہوں نے علیحدگی کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

> ''میں تحقیق کے سلسلے میں اسلامی یونیورسٹی کی بعض پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتا اور اس کی تعلیمی پالیسیوں سے بھی بالعموم متفق نہیں ہوں۔ میں اس ادارے کی موجودہ پالیسیوں سے بھی اتفاق نہیں کرتا۔ یہ وزارت اطلاعات کا ایک شعبہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تحقیقی ادارہ ہے۔ دانش گاہوں اور تحقیقی اداروں کو اطلاعات اور پروپیگنڈے کے اداروں میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔''

ان کے استعفیٰ پر غور ہوتا رہا۔ ادارہ کے ڈائریکٹر اور رفقاء نے ڈاکٹر صاحب کو ''سمجھانے'' کی بہت کوشش کی۔ اس اثناء میں ڈاکٹر صاحب پر ذہنی دباؤ بڑھتا گیا وہ شدید بیمار پڑ گئے۔ آخر ۱۹۸۴ء میں ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا اور وہ اسلام آباد سے واپس اپنے گھر سکھر چلے گئے اور تحقیق و تصنیف کا کام جاری رکھا۔ چند سال بعد قائداعظم یونیورسٹی کے ادارہ برائے معاشی ترقیات نے انہیں شعبہ تحقیق سنبھالنے کی دعوت دی تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور پوری تندہی سے کام کرتے ہوئے یہیں سے ۱۹۹۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ افسوس! اس اثناء میں انہیں گلے کا سرطان ہو گیا' اپریشن پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ بولنے سے معذور ہو گئے لیکن انہوں نے اس معذوری کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تو سکھر چلے گئے جہاں ۷/اگست ۱۹۹۸ء کو انتقال کر گئے۔

انہوں نے اسلامی موضوعات خصوصاً اسلامی معاشیات پر بہت گرانقدر تصانیف چھوڑی ہیں' ان میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

1. Muslim Religious Education in the Sub-continent, (Chicago, 1972)
2. State and Government under the Seljuqs. (Chicago, 1972)
3. Ibn Hazam's Theory of *Muza'ah* (Chicago 1972)
4. Landlord and Peasant in Early Islam. (Islamic Research Institute, 1977)
5. Islam and Feudalism: the Economics of *Riba*, Interest and Profit, (Lahore, Vanguard, 1985)
6. *Riba*, the Moral Economy of Usury, Interest and Profit. (Kulalumpur, 1995)

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کے انگریزی پرچے "Islamic Studies" میں مختلف مسائل پر مقالات لکھے۔

ذیل میں ان کی تصانیف میں پیش کردہ اہم تحقیقات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

زرعی معیشت:

کاشت کار اگرچہ قرون وسطیٰ معاشروں کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی تھے لیکن ان کے بارے میں کوئی تفصیلات نہیں ملتیں، ان کو غیر اہم سمجھا گیا۔ البتہ فقہ اسلامی میں کافی تفصیلات ملتی ہیں جن سے اس عہد کے نظام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حجاز میں جب اسلامی معیشت کے نظام کی ابتداء ہوئی تو بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر کی زمینیں فتح ہوئیں لیکن ان کے بارے میں کوئی ایک واضح اصول طے نہیں ہوا، بعض کو نصف قرار دیا گیا، بعض کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ البتہ ایک بات ضرور واضح ہے جو خلافت راشدہ میں زیادہ صراحت سے سامنے آتی ہے کہ معاشی نظام کی بنیاد معاشی مساوات پر تھی یعنی افراد امت عام طور پر ان مفتوحہ زمینوں کی دولت اور منافع میں مساوی حق کے حامل تھے۔ لیکن ان زمینوں کی مشترکہ ملکیت کے بارے میں کوئی سیاسی ادارہ قائم نہیں ہوا جو اس کا نفاذ کر سکے،

اس کا انحصار زیادہ تر اخلاقی شعور پر تھا۔

بعد میں جب ساسانی اور باز نطینی علاقے فتح ہوئے اور زرخیز زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو حضرت عمر بن خطاب ؓ نے فیصلہ کیا کہ یہ زمینیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے بیت المال کے لیے وقف کر دی جائیں۔

فے کا نظریہ زیادہ واضح طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے میں سامنے آیا اور پھر بنو امیہ کے زمانے میں اس میں مزید ارتقاء ہوا' تاہم اموی دور میں بتدریج اجتماعی ملکیت کی جگہ انفرادی ملکیت کے تصور کو رسوخ ہوتا گیا۔ ساسانی نظریہ کہ زمین کی ملکیت ریاست کی ہے اور خراج گزار ذمی اس کے آجر ہیں۔ فقہاء نے انہی نظریات پر مزارعت مساقات کی فقہ مدون کی۔ اسی طرح تجارت کے میدان میں قرض یا مضاربت دونوں میں کسی کی بنیاد قرآن و سنت پر نہیں تھی بلکہ انہیں مجموعی طور پر ربا کے مفہوم کے سیاق و سباق میں اور تاریخی پس منظر میں سمجھا جائے تو اسلامی تصور معاشیات بہتر طریقے سے اجاگر ہوتا ہے۔ ورنہ اسلامی معیشت عہد حاضر کے مروج اقتصادی نظریات کی نقالی بن کر رہ جاتی ہے۔

ربا کا مسئلہ:

علم اقتصادیات میں ربا کی مختلف تعریفیں ملتی ہیں' سود در سود۔ سادہ سود۔ غیر مکسوب آمدنی' قدر مزید جو وسائل پیداوار کے مالک کو حاصل ہے' یہ مختلف تعریفیں دراصل وہ تعبیری اختلافات ہیں جو سماجی اقتصادی حالات میں ان تبدیلیوں پر مبنی ہیں جو پیداوار کے طریقوں کے اختلاف سے ابھرے۔

قرون وسطیٰ میں' فقہاء اور محدثین کے نزدیک ربا اس اضافے اور زیادتی کا نام تھا جو قرضوں' تبادلہ' خرید و فروخت اور انتقال اموال میں لیا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک ربا پیسے اور اشیاء دونوں کے قرض اور بیع کے معاملات پر لاگو تھا۔ فقہاء عام طور پر ایسی بڑھوتی یا غیر مکسوب کو

ربا کہتے تھے جس کے عوض یا بدل کچھ نہ ہو یعنی قرض دار' مزدور یا صارف کو بدلے میں کچھ نہ ملتا ہو۔ چنانچہ فقہاءؒ نے اس ضمن میں جائز اور عدل پر مبنی مزدوری' جائز قیمت' اور جائز تبادلے کے تصورات پر کام کیا۔ قرآن' تفسیر' حدیث اور فقہ میں ان مسائل پر خصوصاً تفصیلی بحث ملتی ہے۔ ربا کی مختلف اقسام کے بارے میں فقہی ادب میں بہت مواد موجود ہے۔

آج کے زمانے میں ربو کا مسئلہ تقسیم دولت کے مسئلے کے طور پر سامنے آیا۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں آمدنی کا تعین پیداواری عمل کے دوران عوامل پیداوار کے لیے متعلقہ خدمات کی نسبت سے ہوتا ہے۔ کم یاب ذرائع پیداوار یعنی زمین' سرمایہ' محنت' وغیرہ کی قیمت یا عوض اجارہ' سود' منافع اور مزدوری کی شکل میں وہ متعین طبقات طے کرتے ہیں جو مختلف زمانوں میں بنیادی وسائل پیداوار پر قبضہ کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ دولت کی پیداوار اور تقسیم ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر ہو جاتی ہیں۔

ربا کا مسئلہ اس لحاظ سے معاشی بھی ہے اور سیاسی بھی۔ عموماً ربا کے بارے میں ماہرین معاشیات نے جو کچھ کہا ہے' وہ موجودہ سیاسی معاشی نظام کی بقاء کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ زیادہ تر تحقیقات غیرجانبدارانہ اور تجریدی ہیں' تاریخی سیاق و سباق میں نہیں لکھا گیا۔

عہد قدیم اور ظہور اسلام کے وقت ربا اس بڑھوتی یا اضافے کا نام تھا جو پیسوں یا جنس کے ادھار کے معاملات میں وقت کے لحاظ سے وصول کی جاتی تھی۔ اگر ادھار وقت مقررہ پر ادا نہ ہو تو اس تاخیر کی بناء پر جرمانہ کا رواج تھا جو سادہ بڑھوتی بھی ہو سکتا تھا یا اصل رقم سے دوگنی بھی لوٹانا پڑتی تھی۔

تاہم مزید غور سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم میں ربا کا اطلاق محض ادھار کے معاملات پر نہیں بلکہ پیسے اور اجناس کی خرید و فروخت کے معاملات پر بھی ہوتا ہے۔ احادیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا اطلاق قرض کے علاوہ دیگر اقتصادی معاملات پر بھی ہوتا ہے۔ فقہاءؒ کے ہاں ربا نسیی یا ربا فضل کی اصلاحات قرض' بیع' مبادلہ' تجارت' رابحہ' مزارعت

سب معاملات کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ ربا نسیی ایسے معاملات تھے جن میں ان سارے معاہدوں میں ایک متعین اضافہ' مقررہ وقت کے بعد قابل وصول ہو جاتا تھا۔ یہ اضافہ بہت واضح طور پر رہا۔

ربا الفضل کا تصور مبہم ہے۔ یہ زیادہ تر مبادلے کے معاملات میں اور خصوصاً ایسی اجناس کے مبادلے میں ہوتا تھا جن میں ایک جنس زیادہ قیمتی اور دوسری کم قیمتی' اس سے دوسرے فریق کو نقصان ہوتا تھا۔ فقہا' اس نتیجے پر پہنچے کہ زراعت کے تعلق سے مزارعت بٹائی' ٹھیکہ اور فصلوں کو پکنے سے پہلے پیشگی خریدنا سب ربا کی شکلیں ہیں۔ اسی طرح تجارت میں پیشگی فروخت' اجارہ داری' ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری بھی ربا کی صورتیں ہیں لیکن چونکہ یہ ربا نسیی کے تحت نہیں آتی تھیں اس لیے ربا جلی کی شکل نہیں بنتی تھی۔ تاہم فقہا' کا اتفاق تھا کہ جب سرمایہ دار' تاجر ذخیرہ اندوز پیداوار عمل میں حصہ لیے بغیر بیٹھے بٹھائے اضافہ وصول کرتا تھا' تو یہ اضافہ حرام تھا۔ کیونکہ دوسرے فریق کو اس کے مقابلے میں کوئی عوض نہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس اضافے کے لیے "فضل" کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ تاہم فقہا نے اسے باقاعدہ قانونی شکل نہیں دی۔ اس کی حیثیت اخلاقی اور دینی ہی رہی۔ نہ ہی عوض کی نوعیت اور خصائص کا تجزیہ کیا۔ صرف جائز قیمت اور جائز مبادلہ کی بات کی۔ یہ صورت حال جاگیردانہ معیشت کے حسب حال تھی کیونکہ یہاں سماجی اقتصادی معاملات بہت متعین اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔

لیکن اس ابہام کی وجہ سے بعد کے اور آج کی معیشت کے لیے دقتیں پیدا ہوئیں۔ آج مسلمان فقہا' میں دو رجحانات پائے جاتے ہیں' روایت پسند ربو سے مراد محض سود اور سود در سود لیتے ہیں جبکہ تجدد پسند ماہرین معیشت' ربا کے اس سارے تصور کو فرسودہ اور قدیم قرار دے کر آج کی سرمایہ دارانہ معیشت میں ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔

اس ابہام میں مزید اضافہ مضاربہ کی بحث سے پیدا کیا۔ فقہا' نے اس کو اس لیے

بھی جائز قرار دیا تھا کہ یہ اس وقت کی معیشت میں مروج تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاح اضعافا مضاعفہ (دو گنا چو گنا) مضاربہ کے رواج کے حوالے سے زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ پیسہ ادھار لے کر مضاربہ میں لگا دیتے ہیں اور اس طرح دو گنا چو گنا منافع کماتے۔ مضاربہ کا معاہدہ بھی اصلاً قرآن و حدیث پر مبنی نہیں بلکہ قبل از اسلام کا رواج ہے جسے فقہاءٔ نے جائز قرار دے دیا۔ تاہم یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ فقہا نے اسے کب اور کیوں جائز قرار دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب اسلامی سلطنت میں تجارت کو بہت فروغ ہوا تو فقہاءٔ کو مجبوراً ربو کی ممانعت کے احکام پر نظرثانی کرنا پڑی اور سرمایہ پر سود کے معاملے کو جائز قرار دینا پڑا۔ یورپ کے عیسائی معیشت کی تاریخ میں بھی یہی ہوا کہ تیرہویں چودھویں صدی میں عیسائی علماءٔ نے سود کی ممانعت پر نظرثانی کر کے قرض کے معاہدوں میں سود کو جائز قرار دیا لیکن اسلامی فقہ کے بارے میں یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن یہ وجہ اس لیے قابل قبول نہیں کہ عیسائی علماءٔ نے سود کو جائز کیا تو یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام پیدا ہوا اگر فقہاءٔ نے اسی بنیاد پر جواز فراہم کیا ہوتا تو سرمایہ دارانہ نظام پہلے اسلامی معیشت میں جنم لیتا لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لیے یہ وجہ جواز ممکن نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام پر اشتراکی نظریہ معیشت کی تنقید سے وہ بہت سی باتیں واضح ہوئی ہیں جن کا مسلم فقہاءٔ نے ذکر کیا ہے۔ مسلم فقہاءٔ کا ربا فضل کا تصور ایسی معیشت سے تعلق رکھتا ہے جس میں صنعتی سرمایے اور اجرت پر مزدوری کا نظام رائج نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے ربا فضل کی شکل پوری طرح واضح نہیں ہو پاتی تھی۔ مثلاً یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آخر اشیاءٔ کی پیداوار اور تبادلے میں اضافہ یا "سود" کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے جس کا فقہا ذکر کرتے ہیں۔ البتہ اس کی حیثیت محض اخلاقی رہی۔ اب ہم بہت واضح طور پر اس کی مماثلت اشتراکی نظریے "قدر مزید" (سرپلس ویلیو) میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس نظریے میں عوض اور بدل کا تصور زیادہ واضح اور سائنسی بنیادوں پر استوار ہے۔ چنانچہ اس نظریے کی رو سے ایسے تمام معاملات ممنوع ہیں جن میں

دوسرے فریق کو کسی اضافے کے بدلے میں عوض نہ ملتا ہو۔ جدید مسلم فقہا نے اس نئی وضاحت کے پیش نظر قدر مزید کے نظریے کو ربا کے مترادف قرار دیا ہے۔ تاہم اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

اسلامی معیشت دراصل ایک انقلابی معیشت کا آغاز تھا جسے رسول کریم ﷺ نے انقلابی انداز سے قائم کیا لیکن جلد ہی شخصی ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام نے اس انقلاب کا رخ موڑ دیا۔ اس دور میں جو فقہ مرتب ہوئی وہ اس نظام کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ ربو کی ممانعت ایک انقلابی نظریہ تھا جس سے ایک عادلانہ معیشت کا نظام رائج ہوتا۔ اس نظام معیشت کے لیے ایک ایسے سیاسی نظام اور معاشرے کا قیام ضروری ہے جس میں زمین اور سرمایہ اور دیگر وسائل پیداوار معاشرے کی ملکیت ہوں۔ یہ انفرادی اور شخصی ملکیت میں نہ ہوں۔ جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو۔ ربا نسیی اور ربا فضل کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ (سوشلسٹ نظام معیشت نے ربا اور استحصالی معیشت کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی' لیکن عالمی سرمایہ دارانہ نظام' اس تاریخی تجربے کو ایک حد تک ناکام کرنے میں کامیاب رہا۔ لیبیا شاید پہلا مسلم عرب ملک ہے' جہاں بنک سود نہیں دیتے' یا کوئی آدمی اپنے مکان کو کرایہ پر نہیں دے سکتا۔ البتہ ہر آدمی اپنا ذاتی مکان رکھ سکتا ہے۔ اس "محدود ملکیت" سے وہاں ریاست کے "مکمل جبر" کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادارہ)

پاکستان میں ربا کے خاتمے کی کوششیں اس لیے کامیاب نہیں ہو پا رہیں کہ اس کے لیے وہ سیاسی اور معاشی حالات پیدا نہیں کیے گئے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام کو اسلامی رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے' لیکن جاگیردارانہ معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔

وحی و انقلاب:

ڈاکٹر ضیاء الحق کے نزدیک اسلام ایک انقلابی دین ہے اور تمام پیغمبر مقدس انقلابی ہستیاں تھیں۔ ڈاکٹر ضیاء الحق نے اپنی کتاب ''وحی و انقلاب''[1] میں اس نظریے کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس کتاب میں وحی اور انقلاب کا قرآنی تصور، انبیاء کا سماجی مشن، انقلابی انبیاء اور عوام، جہاد، ہجرت اور مساوات کے نظریات کا تجزیہ پیش کیا۔ اس کے بعد مختلف انبیائے کرام کے سوانح ان کے الہامی مشن اور طریق کار پر گفتگو کی ہے۔

خیر و شر کی طاقتوں کے درمیان باہمی جنگ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''ازل سے شر اور جہالت کی قوتوں کے خلاف نیکی، عدل، حق اور نور کی قوتیں مسلسل جہاد میں مصروف ہیں۔ تصادم میں ایک گروہ اقتدار پر قبضہ کر کے دوسروں کو غلام بنا لیتا ہے۔ طبقاتی جنگ میں اقتدار کی جو کشمکش جاری رہتی ہے، اس میں اقتدار کا سرچشمہ دولت، زمین، فوج ہوتی ہیں۔ بادشاہ، فرعون کی شکل میں خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انبیاء کرام '' وہ انقلابی ہیں جو سرمایہ داری کے دور سے پہلے کے معاشروں میں انسانوں کی آزادی کے لیے لڑے۔

> ''شر اور استبداد کی قوتوں کے خلاف جدوجہد میں انقلابی پیغمبروں نے انبیاء اور انقلابی دونوں کردار مذہبی تناظر میں ادا کیے۔''
>
> ''مقدس مذہبی صحیفے، قرآن اور بائبل، دونوں میں جاگیرداری دور سے پہلے کے Pastoral (چرواہا) اور قبائلی معاشروں میں سماجی اور اقتصادی مسائل کو بیان کرنے کے لیے کہانیوں، مکالموں اور استعاروں میں بات کی گئی ہے۔ ان میں ان مختلف طبقات کے معاشی خصائص یا کردار کا صراحت اور تفصیل سے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان صحائف میں ایک طرف ظالم، مترف، متکبر، الملاء، فراعنہ، اور دوسری

(1) Revelation and Revolution in Islam (Lahore: Van Guard, 1987)

طرف مستضعفین اور اراذل کی اصطلاحوں میں جاگیردارانہ معاشرت سے
پہلے کی طبقاتی ترکیب کا ذکر ہے۔ اس معاشرت میں پیغمبر، غلاموں کے
آقاؤں، تاجروں اور مذہبی پیشواؤں کے خلاف انقلابی جنگ میں
مظلوموں کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔''

آج کے دور میں نقشہ مختلف ضرور ہے لیکن کردار اور جنگ وہی ہے، طبقاتی جنگ جاری ہے۔ جدید انقلابی، ظلم کے خلاف انقلابی پیغمبروں کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی ؐ سے شرار بولہبی

(محمد خالد مسعود)